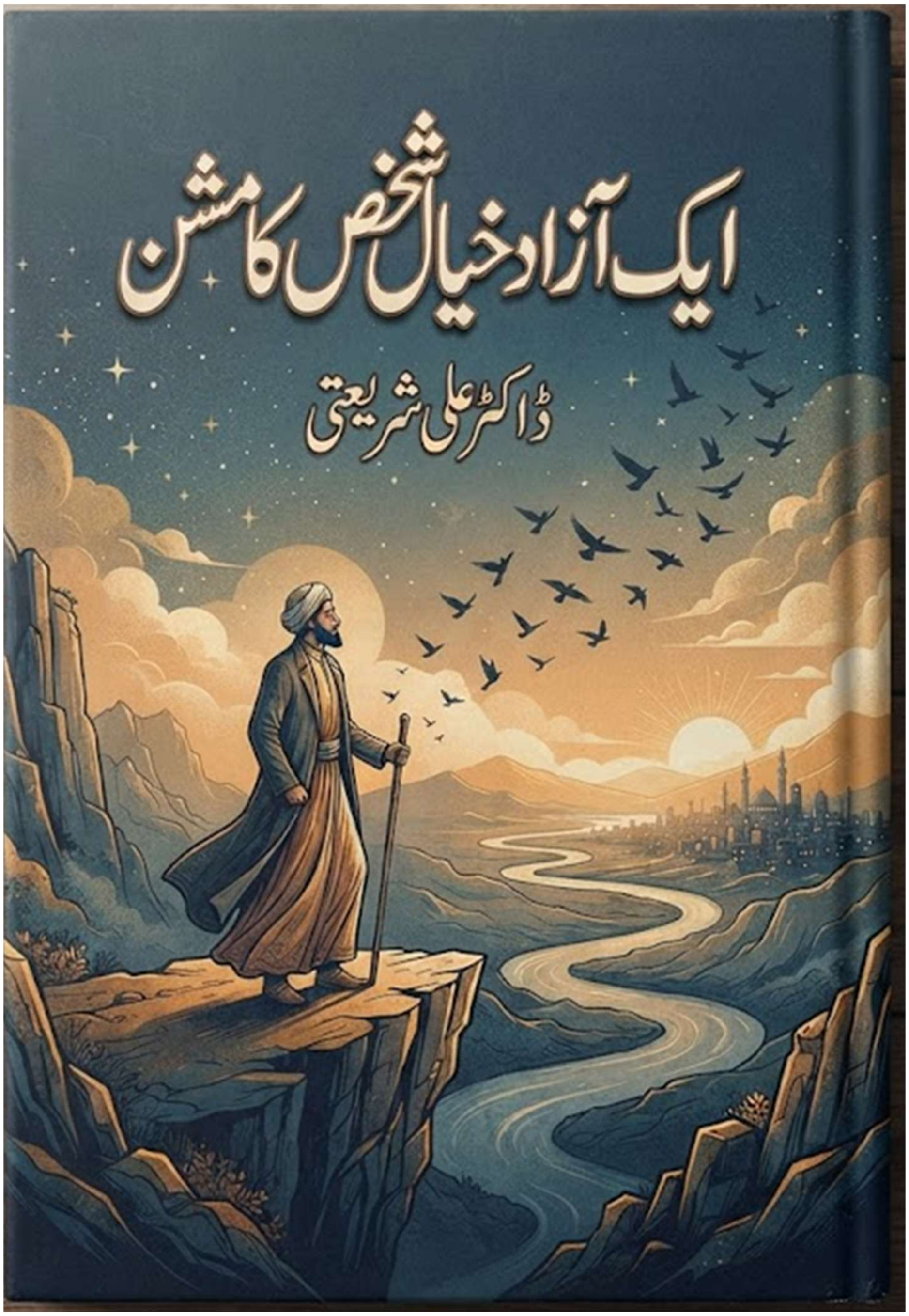

ایک آزاد خیال شخص کا مشن
ڈاکٹر علی شریعتی

ایک آزاد خیال شخص کا مشن

ڈاکٹر علی شریعتی

سوال: فرض کریں کہ ہم حقیقی آزاد سوچ رکھنے والے ہیں، ہمارا معاشرہ سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟ ہمیں کون سا راستہ چننا چاہیے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ ہم آزاد مفکروں اور لوگوں کے درمیان تعلق پر بات کریں، ہمیں پہلے خود فری تھنکرز سے شروعات کرنی چاہیے۔ یعنی ہمیں آزادانہ سوچ کو اس کے حقیقی معنوں میں سمجھنا چاہیے۔ کیا ہم اس بات کا یقین کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے معاشرے کے آزاد سوچ رکھنے والوں کے ساتھ اپنا بال جھکا سکتے ہیں اور جو کچھ ہمارے پاس ہے ان کے ساتھ بانٹ سکتے ہیں؟

مجھے یقین ہے کہ ہم ابھی تک دوسرے مرحلے تک نہیں پہنچے ہیں (فری تھنکرز اور لوگوں کے درمیان تعلق)۔ لیکن یہ فرض کرتے ہوئے کہ جب ہم عوام کے ساتھ ملتے ہیں تو کیا ہم ان سے بات کرنا جانتے ہیں؟ ہمارے پاس ان کے ساتھ اشتراک کرنے کے لئے کیا ہے؟ ہمارے پاس ان کے لیے کیا پیغام ہے؟ یہ واقعی ایک مشکل مسئلہ ہے۔ کیا ہمیں اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کہ ہمارا معاشرہ ایک مذہبی ہے، عوام الناس کی آراء اور افکار کو رد کر دینا چاہیے؟ کیا ہمیں عوام کو حکم دینا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو کیا ہم عوام کو ان کی مذہبی حماقت میں مزید مضبوط اور پرعزم نہیں بنا رہے ہیں؟ اگر ہم نے ان کے خیالات کی تردید کی تو کیا ہم ان سے دور نہیں ہو گئے اور انہیں ان رجعت پسندوں کی گود میں نہیں ڈال دیا جو ہم سے لڑ رہے ہیں؟ ہم نے دیکھا کہ دونوں صورتوں میں مسئلہ حل طلب ہی رہا ہے۔ دوسری طرف، ہم بنیادی طور پر اب بھی پچھلی دو صدیوں کے یورپی دانشوروں کے افکار پر عمل پیرا ہیں۔ اس طرح کے خیالات، ڈیزائن اور خیالات ہماری فضا کے ساتھ ساتھ ہماری ذمہ داریوں کو کس حد تک روشن کر سکتے ہیں؟

سب سے پہلے، یورپی دانشور ایک ایسے کارکن کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے جو قرون وسطیٰ کی تین صدیوں اور نشاۃ ثانیہ کی دو صدیوں سے گزر چکا ہے۔ دوسرا، یہ

کارکن ایک ایسے ماحول میں رہتا ہے جس میں مذہبی جذبے کا غلبہ نہ ہو۔ تیسرا، وہ صنعتی پرولتاریہ کے مرحلے پر پہنچ گیا ہے۔ چوتھا، وہ ایک اچھی طرح سے ترقی یافتہ صنعتی بورژوا نظام میں رہتا ہے جس میں تعلقات صنعتی نوعیت کے ہوتے ہیں، اور آخر کار، محنت کش ترقی اور خود شعوری کے اعلیٰ درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ یورپی دانشور سامعین (صنعتی پرولتاریہ) نے معاشرے میں ایک الگ اور آزاد طبقے کی تشکیل کی ہے جس نے ایک خاص ثقافتی رعایت تیار کی ہے، اور مغربی یورپی معیشت کی بنیاد میں تشکیل دی ہے۔ اب فرض کریں کہ ایک آزاد سوچ رکھنے والا، (جو 19ویں صدی کے دانشوروں کے نظریات کی تقلید کرنا چاہتا ہے)۔ میں ایک ایسے ایرانی کارکن سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس میں 19ویں صدی کے دانشور سامع کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ میں ایک ایسے معاشرے میں رہتا ہوں جس میں بڑے شہروں کے علاوہ بورژوا طبقہ اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے معاشرے میں آج بھی مزدور طبقہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ صرف گروپس ہیں۔

قدیم ترین اور کرپٹ معاشروں میں محنت کشوں کے گروہ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، سعودی عرب میں (جہاں صنعتی وسائل اور مغربی پیداوار ہیں) میں تقریباً 2000-500 کارکن سب سے اوپر رہتے ہیں، لیکن ملک میں مجموعی طور پر ورکرز کی بنیاد کا فقدان ہے۔ اس کی قبائلی، زرعی یا جاگیردارانہ بنیاد ہے۔

مزید یہ کہ ہم 19ویں صدی میں نہیں رہ رہے ہیں۔ جب ہم ایشیا اور افریقہ میں اپنے معاشروں کی خصوصیات کا یورپی معاشرے سے موازنہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہم تیرہویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ لہٰذا، ہمیں پہلے دریافت کرنا چاہیے کہ ہم کس صدی میں رہتے ہیں، اور پھر اپنے خیالات کو سمجھیں اور انہیں سکھائیں۔ 19ویں صدی کے نظریات کو 13ویں صدی کے معاشرے میں استعمال کرنا نہ صرف ہمیں ہوا میں معلق چھوڑ دیتا ہے بلکہ یہ بھی بیکار ہوتا ہے جب ہم کسی سننے والے کو وہی چیزیں نہیں ڈھونڈ پاتے جن کا سامنا ہمارے آزاد سوچ رکھنے والوں کو کرنا پڑ رہا ہے۔

ہمارے آزاد مفکرین 13ویں صدی میں جی رہے ہیں لیکن ان کے الفاظ، خیالات اور نظریات 19ویں اور 20ویں صدی کے مغربی یورپی دانشوروں سے مستعار لیے

گئے ہیں۔ اور یوں انہیں کوئی سننے والا نہیں ملتا۔ ہمارے سامعین "کلاسیکی" بورژوازی ہیں جن کا یورپی بورژوازی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے بازاروں کی بورژوازی 100% مذہبی ہے جبکہ یورپی 100% غیر مذہبی ہے۔ یورپی بورژوازی اتنی ترقی پسند ہے کہ اس نے فرانسیسی انقلاب برپا کیا جب کہ ہمارے لوگ صرف روایت کی تلاش کے لیے بازاروں میں گھل مل جاتے ہیں۔

ہمارے عوام کے نقطہ نظر سے، اوسط شہری ایک دیہاتی ہے۔ وہ ہمارے سننے والے ہیں اور آپ ان سے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔ جان مور نے 1864 میں برطانوی محنت کشوں سے بات کی تھی۔ اور اس طرح یہ سوچنا کہ ہم 19ویں یا 20ویں صدی میں رہ رہے ہیں، غلطی ہے، اسی طرح ان دو صدیوں کے یورپی دانشوروں کو اپنا نمونہ سمجھنا بھی ایک غلطی ہے۔ لہٰذا، ہمیں سب سے پہلے 10ویں صدی کے یورپی "مشمولات" کو اپنے سر سے باہر پھینکنا چاہیے اور پہلی بار اپنی صدی کو دریافت کرنا چاہیے۔

دنیا میں اب ایسی قومیں بھی ہیں جو ماقبل تاریخ کے مرحلے میں زندگی گزار رہی ہیں، یعنی وہ ابھی تاریخی دور میں داخل نہیں ہوئیں۔ لہذا، 20 ویں صدی میں رہنا اس میں رہنے سے مختلف ہے۔ اس کے مطابق، ہمیں سب سے پہلے اپنی صدی کو دریافت کرنا چاہیے، اور پھر یوروپ کے ایک جیسے آزاد مفکرین سے سیکھنا چاہیے جو ہماری صدیوں کے ہمارے نظریات سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اب ہم 13ویں یا 14ویں صدیوں میں رہ رہے ہیں (قرون وسطیٰ کے اختتام یا جدید دور کے آغاز)۔ یورپ میں، یہ جاگیرداری اور روایتی مذہب سے بورژوازی کی طرف منتقلی کے ادوار تھے جو ایک کھلے عالمی وژن، انقلابی بورژوازی اور مذہب کے خلاف احتجاج کی علامت ہیں۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں یہ تمام حالات ہیں۔ تاہم ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یورپ نے 13ویں اور 14ویں صدی میں کیا کیا۔ اور وہ کیا وجوہات تھیں کہ یورپی فری تھنکرز نے اپنا کردار اس قدر احسن طریقے سے ادا کیا کہ انہوں نے منجمد اور جمود کا شکار قرون وسطیٰ کو ایک نئے یورپ میں بدل دیا؟

بنیادی عوامل جنہوں نے یورپ میں نئی تہذیب کو وجود میں لانے میں مدد کی وہ معاشی اور فکری نوعیت کے تھے۔ معاشی طور پر جاگیرداری بورژوازی میں بدل گئی۔ رجعت پسند اور ادنیٰ اشرافیہ کی جگہ بورژوازی ابھری۔ یہ مشرق و مغرب کے

تعلقات، صلیبیوں، امریکہ اور آسٹریلیا کی دریافت، تجارت اور افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ اور یہاں تک کہ شمالی امریکہ کے استحصال کی وجہ سے تھا۔ فکری طور پر یہ تبدیلی کیتھولک سے پروٹسٹنٹ ازم کی طرف تھی۔ 14ویں صدی کے آزاد مفکر نے مذہب کی نفی نہیں کی، اس نے اپنے جھکاؤ کو آخرت سے اس دنیا کی طرف بدل دیا۔ روح، فطرت، اخلاقیات، اور کام اور کوشش کی طرف رجحان سے؛ تصوف سے اعتراض تک اور نفس پرستی سے سماج کی مرکزیت تک۔ مختصراً، وہی طاقتور ثقافتی اور مذہبی وسائل جو یورپ کے قلب میں غیر فعال تھے، آزاد سوچ رکھنے والوں کے ذریعے متحرک، ابھرتی ہوئی، تخلیقی اور تعمیری قوتوں میں تبدیل ہو گئے۔

اس لیے ہمیں سارتر، مارکس اور روسو کے کہنے کے بجائے اس حقیقت پر انحصار کرنا چاہیے۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کا ہماری اگلی دو صدیوں سے تعلق ہے۔ ہمیں اپنی ذہنی اور جسمانی تسکین کے بجائے اس معاشرے کے لیے کام کرنا چاہیے جس میں ہم اب رہتے ہیں۔ اب ہمارے لیے جو چیز اہم ہے وہ لوتھر اور کیلون کے کام ہیں، کیونکہ انہوں نے کیتھولک اخلاقیات (جس نے یورپ کو صدیوں سے روایت میں قید کر رکھا تھا) کو ایک متحرک اور تخلیقی قوت میں بدل دیا۔ مثال کے طور پر، میکس ویبر نے سرمایہ داری اور پروٹسٹنٹ اخلاقیات کے درمیان تعلق پر بحث کی۔ اس نے دلیل دی کہ وہ کیتھولک ممالک جیسے کہ سپین، فرانس اور اٹلی انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ سے کم ترقی پسند تھے جو کہ زیادہ تر پروٹسٹنٹ تھے۔ یعنی ویبر نے برقرار رکھا کہ پروٹسٹنٹ اخلاقیات اور سرمایہ داری کے درمیان براہ راست تعلق ہے۔

ہم نے دیکھا کہ جن ممالک نے کیتھولک مذہب کو اس کی رجعتی شکل سے ایک تخلیقی اور احتجاجی قوت میں تبدیل کر دیا ہے وہ آگے بڑھ چکے ہیں۔ دوسری طرف جن ممالک نے کیتھولک مذہب کو اپنا رکھا ہے وہ قرون وسطیٰ کی حالت میں ہیں۔ جغرافیائی طور پر، سپین اور تاریخی طور پر، اٹلی اس پوزیشن میں تھا کہ یورپ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک تھے۔ سب سے پہلے، سپین کا یورپ میں سب سے روشن ماضی تھا اور روم (اسلام سے پہلے) عیسائی تہذیب کا مرکز تھا۔ دوسرا، 15ویں اور 16ویں صدی کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا آغاز اٹلی میں ڈی ونچی، مائیکل اینجلو اور گیلیلیو جیسے عظیم فنکاروں اور مفکروں کے ساتھ ہوا۔ اگرچہ ماضی میں اسپین روم جیسا نہیں تھا، لیکن 8ویں سے 12ویں صدی تک اس نے سب سے زیادہ اسلامی

تہذیب کا کردار ادا کیا، اور اس نے یورپ کو اسلامی تہذیب و تمدن کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ تہذیب کے یہ دو موہرے اب یورپ میں سب سے پیچھے ہیں۔ جب کہ امریکہ، انگلستان اور جرمنی، جو تہذیب کے ساتھ سب سے آخر میں پکڑے گئے تھے، سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان میں تہذیب، صنعت، سرمایہ داری اور مادی طاقت صرف مذہبی عوامل اور مذہبی اختلافات کی روشنی میں قابل وضاحت ہے۔ اور اس طرح، اس مقام پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ 14ویں سے 17ویں صدیوں کے بھاگنے والے مفکرین نے اپنے پرانے عقیدے کو ختم کر کے، اور روایتی کیتھولک ازم کو ایک احتجاجی، عالمی ذہن، سیاسی اور مادہ پرست پروٹسٹنٹ ازم میں تبدیل کر کے اپنی نئی منزل تلاش کی۔

ایسا مشن مذہبی مشرق کے لیے بھی دستیاب ہے جو قرون وسطیٰ کے آخر میں رہ رہا ہے۔ لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم 19ویں اور 20ویں صدی کے یورپی مفکرین کی نقل کریں اور مذہب کو مسترد کریں۔ ایران جیسے معاشرے میں، جس کی بنیاد مذہبی ہے، ہمیں اپنے آپ کو ایک نام نہاد آزاد سوچ رکھنے والے کیڈر میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے (جو کافی ہاؤسز، کیبریٹس اور پارٹیوں میں "بڑی باتیں کرنے" اور نئی شخصیات کی تلاوت کر کے دکھاوے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں)، جب کہ ہمارے اوسط شہری اب بھی قرون وسطیٰ میں زندگی گزار رہے ہیں، جن کی ہماری صلاحیتوں، مذہب اور تحریر تک رسائی نہیں ہے۔

کوئی بھی اسکول جو معاشرے کی ثقافتی بنیادوں پر مبنی نہیں ہوتا ہے وہ لائبریری میں ایک اچھی کتاب کی طرح لگتا ہے جسے صرف طلباء اور پروفیسروں کا ایک چھوٹا گروپ استعمال کرتا ہے۔ ایسی ہزاروں کتابیں چھپ جائیں تو بھی عوام پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تاہم، سب سے بڑا خطرہ آزاد مفکر کا معاشرے کے تناظر سے خود کو الگ کرنا ہے۔ اگر ایک آزاد سوچ رکھنے والا اپنے آپ کو اپنے معاشرے سے الگ کر لیتا ہے، چاہے وہ کہیں بھی جائے یا کچھ بھی کرے، اس کا معاشرہ ہمیشہ کی کرپشن میں مبتلا رہے گا۔ مثال کے طور پر پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ایویسینا، غزالی (تاریخ کے دو عظیم اساتذہ) جیسے مفکرین کا انتقال اس معاشرے میں ہوا جو سلجوق اور غزنوی ادوار میں بدعنوانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیوں؟ کیونکہ یہ آزاد سوچ رکھنے والے معاشرے سے دور رہے (نتیجتاً ہمارا اچھا ہوتا اگر ایویسینا،

غزالی، فخر اور زکریا رازی کی جگہ ایک ابوذر ہوتا؛ تمام اسلامی معاشرے سلجوق، غزنوی اور منگولوں کی گرفت سے بچ جاتے۔

قدیم یونان میں بھی ارسطو جیسے آزاد سوچ رکھنے والے تھے۔ لیکن ارسطو کی پوری زندگی میں ایتھنز کے لوگ بدعنوانی، اشرافیہ اور غلامی کا شکار رہے۔ دوسری طرف، سپارٹا میں ایک بھی فلسفی نہیں تھا، لیکن یہاں کے لوگ کھلاڑی اور بہادر تھے۔ ایتھنز میں سینکڑوں ادیب، فلسفی وغیرہ معاشرے کو تبدیل اور منظم نہیں کر سکے، ان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مشرق، (مثلاً ایران) میں ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملکوں سے باہر ایک افلاطونی باغ بنا لیا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ تہران جائیں اور چند کیفے دیکھیں تو آپ بہت سے آزاد سوچ رکھنے والوں، سوشلسٹوں، وجودیت پسندوں وغیرہ سے ملیں گے۔ ان کے پاس اپنی خصوصی اشاعتوں کے ساتھ ساتھ خیالات کی ایک سپر مارکیٹ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے گلی کے عام آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ یہ "آئیڈیلسٹ" کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں،

س: کیا لوگوں سے بات کرنے کے لیے ان کی زبان جاننا کافی ہے؟

یہ بالکل واضح ہے۔ فرض کریں کہ میں کسی گاؤں میں جاتا ہوں اور مسجد میں جاتا ہوں۔ ایک ملا ایک ناقابل فہم اور مبہم بات کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی جگہ لے سکتا ہوں اور لوگوں سے بات کر سکتا ہوں تاکہ وہ مبلغ کی خامیوں اور شاید گمراہ کن بیانات کو دیکھ سکیں، تو میں اپنے مشن کو ایک آزاد سوچنے والے کے طور پر جانتا ہوں۔ تاہم، اگر میں کسی کونے میں گھس کر گاؤں والے سے یہ سوچ کر بات کرنا چھوڑ دوں کہ وہ بیوقوف ہے یا خوف کی وجہ سے یا ملا کی طرف سے "ناپاکی" کا الزام لگایا جا رہا ہے، تو میں جاہل اور احمق ہوں گا۔ مجھے یہ دیکھنا چاہیے کہ ملا کیا کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ لوگ اس کی بات کیوں سن رہے ہیں؟ کیا اس کی گفتگو نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے یا کسی اور طرح کی روایت اور ورثہ؟ اگر ہمیں اپنے جوابات مل جائیں تو نہ صرف ہم گاؤں والوں سے زیادہ مؤثر اور خلوص سے بات کر سکتے ہیں بلکہ اس کے نتیجے میں ہم ملّا کے مقام پر فائز ہو سکتے ہیں اور معاشرے میں آزاد سوچ رکھنے والوں کے لیے

ایک بنیاد تلاش کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر ہم بیٹھ کر فلسفے سے کچھ حاصل نہیں کریں گے۔

س: کیا آپ خود کو لوگوں پر مسلط کر سکتے ہیں جیسا کہ آپ ہیں یا ان کی زبان میں بات کرنا کافی ہے؟ مثال کے طور پر، اگر میں آزاد خیال بننا چاہتا ہوں اور ان سے بات کرنا چاہتا ہوں، تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہی لباس پہنوں جیسا کہ وہ کر تے ہیں؟

ان کی قسم کا لباس پہننا ضروری نہیں ہے۔ اس قسم کے طریقہ کار یا طریقہ کار امریکی ماہرین عمرانیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ میں اپنے کپڑے یا چہرہ بدلوں اور غیر ملکیوں کی نقل کروں۔ اگر میں کسی مسجد میں جا کر عوام کو اس سے زیادہ دلکش اور منطقی حسین کی وضاحت کروں جو ملا کے کرتا ہے تو وہ میری بات زیادہ سنیں گے۔ تاہم، جب تک ملا دیہاتیوں کی ذہنیت پر حاوی ہے اور میں (ایک آزاد سوچ رکھنے والے کے طور پر) دائروں میں جا رہا ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میری یمرنگ کتنی ہی جدید کیوں نہ ہو، وہ ایک بھی قیمت کے قابل نہیں ہیں۔ وجودیت پسندوں اور سوشلسٹوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میرا کام گاؤں والوں کے ذہنوں کو متاثر کرنا ہے۔

ایک بار میں ایرانی فلم ڈائریکٹر کا ایک مضمون پڑھ رہا تھا جس نے 'When The Storks Fly' بنایا تھا۔ انہوں نے کہا، "اگر کوئی ہدایت کار کسی دیہاتی کو جاننا چاہتا ہے، تو اسے یہ جاننے کے لیے کسی کا دوست بننا چاہیے کہ وہ کیا کہتا ہے اور محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے کس قسم کے مسائل، نظریات اور درد ہیں۔ ہمیں اس کے ساتھ بات کرنے اور رہنے کا طریقہ سیکھنا چاہیے تاکہ ہم اس کے انداز کو تلاش کر سکیں۔" اس لیے ایک آزاد سوچ رکھنے والے کو اپنے معاشرے کا ڈائریکٹر ہونا چاہیے۔ یعنی اسے ہمیشہ اپنے معاشرے کا ڈیزائنر محسوس کرنا چاہیے۔ فرض کریں کہ ہم میں سے کچھ آزاد سوچ رکھنے والے ایک کافی شاپ کے اندر گرتے ہیں جس میں عام آدمی گپ شپ کرتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔ اچانک دکان پر خاموشی چھا جائے گی، ہر کوئی مذاق کرنا، باتیں کرنا اور کام کرنا چھوڑ دے گا! وہ ہمیں اس طرح گھورتے رہیں گے جیسے ہم مریخ سے آئے ہوں، ہمیں جلد از جلد وہاں سے باہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم آزاد سوچ رکھنے والے اس ماحول میں سیاق و سباق سے باہر

ہیں، کیونکہ ہم اس کافی شاپ میں سننے کے بجائے بولنے کے لیے آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمیں عوام کے دلوں میں جانا چاہیے متکبرانہ رویہ کے ساتھ۔

ایک بار جلال نے مجھ سے کہا، "جب میں مشہد مقدس سے باہر نکل رہا تھا، تو میں اپنے کوٹ کو کندھے پر لٹکائے ہوئے لنگر انداز ہونے لگا، ایک دیہاتی میرے پاس آیا اور کہنے لگا، 'ارے یار، تم یہ کوٹ کتنے میں بیچ رہے ہو؟' میں نے کہا، 'میرے آدمی، یہ فروخت کے لیے نہیں ہے۔' جلال اس سارے واقعے پر بہت خوش ہوا کیونکہ اس نے اس کا کوٹ خریدنا چاہا کہ اسے ایک دیہاتی کی غلطی سمجھنا ایک قابل ذکر کارنامہ تھا، میں نے جلال سے کہا، "ہاں، یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی، لیکن اس شخص کے پاس تم سے بہتر بصیرت تھی، جب اس نے تم سے برا سلوک کیا۔ 'میرے آدمی، یہ فروخت کے لیے نہیں ہے' ایک آزاد سوچ رکھنے والے کا مناسب جواب نہیں تھا، کیونکہ آپ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اس نے غلطی کی ہے۔ اس طرح، اس نے خود کو ملامت کیا کہ آپ کو کسی اور کے بارے میں غلط سمجھا۔ آپ کو اس کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس نے آخر کار یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ کندھے پر اوپر کوٹ والا آدمی نہیں کہے گا، 'میرا آدمی...' کیونکہ اس کلمات نے گاؤں والے کو بتایا کہ آپ اجنبی ہیں اور آپ کا تعلق ایک مختلف طبقے سے ہے!

س: آپ جو تجویز کر رہے ہیں اسے پورا کرنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ ہم ان سب کو کیسے پورا کر سکتے ہیں؟

سماجی مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمیں مختصر ترین راستہ نہیں سوچنا چاہیے بلکہ صحیح ترین طریقہ سوچنا چاہیے۔ ہمارے زیادہ تر آزاد مفکرین کے کہیں نہ پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کئی راستے دریافت کرنے کے منتظر ہیں۔ اور جب انہیں احساس ہوا کہ وہ زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تو وہ مایوس ہو گئے اور جدید شاعری لکھنے کا سہارا لیا: مثال کے طور پر، "پچھلے اٹھارہ سالوں سے، ہم نے گلیوں میں کچھ کیٹ کال کی، افسوس! کوئی فائدہ نہیں ہوا! تو ہم مایوس ہو گئے۔ آہ! ہمیں مایوس ہونے کا کوئی حق نہیں ہے!"

نقطہ یہ ہے کہ ہمیں بہترین اور منطقی طریقہ کا انتخاب کرنا چاہیے جو ہمیں اپنے مقصد کی طرف لے جائے۔ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ہم سطحی ملازمتوں کے

پیچھے ہیں، تو وہ کئی بار ہو چکے ہیں، اور ہر بار مایوسی کا شکار ہو کر ہم اپنے نقطہ آغاز پر واپس آ چکے ہیں۔

ایک آزاد سوچ رکھنے والے کا کام معاشرے کی قیادت کرنا نہیں ہے۔ یہ سب سے سنگین غلطیوں میں سے ایک ہے جو دنیا بھر کے آزاد سوچ رکھنے والے کرتے ہیں۔ سرکردہ لوگوں کے لیے سب سے بیکار عناصر آزاد سوچ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ تمام افریقی اور ایشیائی بغاوتوں میں آپ کو آزاد سوچ رکھنے والوں کے چہرے کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ بلکہ انقلابی رہنما عوام اور عام لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔ آزاد سوچ رکھنے والے ہمیشہ انقلابات کے لیے بدترین تباہی کا شکار رہے ہیں۔

1960 میں شمالی افریقہ میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر شمالی افریقی انقلاب کامیاب ہو جائے اور افریقہ آزاد ہو جائے تو قیادت کے عہدے (وزارت تعلیم، اقتصادیات وغیرہ) انقلابیوں اور گوریلوں کے بجائے آزاد سوچ رکھنے والوں کو دیے جائیں۔ لیکن فری تھنکرز کون تھے؟ جو بیرون ملک مقیم تھے ڈاکٹریٹ پر کام کر رہے تھے جبکہ انقلابی خندقوں میں لڑ رہے تھے۔ اور اس طرح، انقلابی کو اپنی بندوق چھوڑنی چاہیے، اپنا کاروبار کرنا چاہیے تاکہ انجینئر اور ڈاکٹر (جو بیرون ملک تھے) قیادت کر سکیں۔ بدقسمتی سے وہ معاشرے جن میں کامیاب انقلابات آئے وہ قدامت پسند اور بدعنوان ہو گئے جب دانشوروں اور تعلیم یافتہ افراد نے انقلابیوں سے قیادت چھین لی۔ تیونس ایک عام مثال ہے۔ اس لیے آزاد سوچ رکھنے والوں کا کام کسی معاشرے کی سیاسی قیادت نہیں ہے، بلکہ ان کا کام صرف عوام میں شعور بیدار کرنا ہے، بس۔ اگر ایک آزاد سوچ رکھنے والا اپنے معاشرے کو بیدار کرتا ہے تو اس کے مشن کی پیداوار ہیرو ہوں گے جو خود آزاد سوچ رکھنے والوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اور جب تک ہیرو نہیں ہیں، فری تھنکرز کا مشن ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ مذہب، فن، لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا طریقہ، شاعری اور تھیٹر سبھی اہم عوامل ہیں جن کے ساتھ آزاد سوچ رکھنے والے کام کر سکتے ہیں۔ ان سے زیادہ کو سنبھالنے کی کوشش بیکار ہے۔ یعنی، ایک آزاد سوچ رکھنے والے کا مشن صرف اس اجنبی معاشرے (یورپیوں کے ذریعے) کو اس کی حقیقی ذات کی طرف لوٹانا، اس کے کردار اور اس کے "ہنوا ہوا" انسانی جذبات کو بحال کرنے اور طبقاتی شعور، ایمان اور قومی تاریخ کو اس کے اوپر عطا کرنے تک

محدود ہے۔ اس طرح کے مشن کو پورا کرنے کے لیے، سب سے زیادہ منطقی طریقہ (بجائے مختصر ترین) کا انتخاب کرنا چاہیے۔

آزاد سوچ رکھنے والوں کے برعکس جو زیادہ کی توقع رکھتے ہیں اور کم قربانی دیتے ہیں، ہمیں زیادہ قربانی اور توقع کم کرنی چاہیے۔ میں اس کے بجائے دو تین نسلوں کو کام کرتے ہوئے دیکھوں گا اس سے پہلے کہ ان کا کوئی نتیجہ نکلے۔ مثال کے طور پر، اگر ہم دس سال کے اندر اپنے اہداف تک پہنچ جاتے ہیں، تو ہم سو سال پیچھے جانے کے لیے موزوں ہیں۔ افریقہ اور ایشیا میں ہمیں ہمیشہ ایک عجیب تجربہ رہا ہے۔ وہ ممالک جو اپنے مقاصد کو تیزی سے حاصل کر چکے ہیں، وہ اپنی سابقہ مراعات بھی کھو چکے ہیں۔ اس لیے میں تمام "فوری" اور نادان انقلابات کی مذمت کرتا ہوں۔

س: آپ کی رائے میں ہمیں، خود کو یا کسی اور کو بنانا چاہیے؟

کوئی نہیں۔ صرف اپنے آپ کو۔ اسی طرح افریقی آزاد سوچنے والوں نے کیا۔ انہیں کس نے بنایا؟ فرانس میں ایک افریقی کی مذمت کی جاتی تھی، امریکہ میں ریستورانوں سے باہر پھینک دیا جاتا تھا، اور انگلینڈ میں انسان کے طور پر اس پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ تاہم، اس نے اب خود شعور حاصل کر لیا ہے حالانکہ ان میں سے کچھ ابھی تک لکھنا نہیں جانتے ہیں۔

ایک بار میں فرانس میں ایک دکاندار سے ملا۔ وہ مسلمان تھا، اور قرآن کی جو آیات اس نے حفظ کی تھیں، وہی اس کی سماجی جدوجہد کے لیے فائدہ مند تھیں۔ یہی بات ان شخصیات کے بارے میں بھی درست تھی جن کو وہ جانتے تھے اور جو تاریخ انہوں نے پڑھی تھی۔ یہ سب اسے شعور دے رہے تھے۔ وہ ہر ملک سے اتنا واقف تھا اور دنیا کے مسائل کا اس حد تک تجزیہ کر رہا تھا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اس آدمی کی تربیت کس نے کی؟ کیا اس کی تربیت یونیسکو کے کسی ماہر، کسی نبی، سوربون کے بائیں بازو کے پروفیسروں یا خود نے کی تھی؟

س: افریقی مفکر کے معاملے میں اسے اس قدر حقیر سمجھا گیا کہ اس نے اسے شعور حاصل کرنے میں مدد دی۔ لیکن حقیر ہونا ہمارے معاملے میں اتنا درست نہیں ہے۔ ہے؟

یہ درست نہیں کہ ہمیں حقیر نہیں سمجھا جا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا علم ہی نہیں کہ ہماری توہین کی جا رہی ہے۔ آج کا سیاہ فام وہی آدمی ہے جسے 17ویں اور 18ویں صدی میں پیرس میں حقیر سمجھا جاتا تھا۔ 15 ویں اور 16 ویں صدیوں میں انہیں بحری جہازوں (جیسے کھیرے) میں لے جایا گیا تھا جو امریکہ کے لیے مقرر تھے۔ انہیں غیر معمولی قیمتوں پر خریدا گیا اور امریکہ اور آسٹریلیا میں بہت زیادہ قیمتوں پر فروخت کیا گیا۔ اس وقت ان غلاموں کو یہ احساس نہیں تھا کہ ان کی تحقیر کی جا رہی ہے، لیکن اب وہ کرتے ہیں۔

تاہم، حقارت کی نوعیت اور خود میں تضاد کا وجود شعور حاصل کرنے کے ذمہ دار عوامل نہیں ہیں۔ جب تک انسان کی مرضی نے تضاد کو تلاش نہیں کیا، یہ ایک ہزار سال تک معاشرتی تناظر میں رہے گا۔ ایک سیاہ فام کو دوسروں کو بیدار کرنے کا عنصر بننے کے لیے حقارت کا احساس ہونا چاہیے۔ مجھے اپنے دشمن کو پہچاننا اور محسوس کرنا چاہیے۔ لیکن جب تک میں اسے محسوس نہیں کرتا، میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے پاس جاتا ہوں، اور اس کے قریب جانے میں بھی فخر محسوس کرتا ہوں تاکہ وہ اب میرا دشمن نہ رہے۔ ایرانی شخص جو ایک یورپی (جس نے اپنے ملک اور تاریخ کو تباہ کر دیا ہے) کے ماتحت کام کرنے پر فخر محسوس کیا ہے، اب اس کا کوئی دشمن نہیں بلکہ باس ہے۔ اور مالک بندے میں شعور پیدا نہیں کرتا۔ ایک دشمن اینٹی تھیسس ہے جو شعور پیدا کرسکتا ہے لیکن صرف اس صورت میں جب اسے "احساس" ہو کہ اس طرح کا تضاد موجود ہے۔

آزاد مفکر اور فنکار کا کام معاشرے کے دل میں موجود تضادات اور تضادات کو دور کرنا اور انہیں معاشرے کے احساس اور شعور میں داخل کرنا ہے۔ جب تک ایسے تضادات معروضیت میں موجود ہیں وہ کوئی حرکت پیدا نہیں کریں گے۔ بیسویں صدی میں ہم اب بھی ایسے معاشروں کو دیکھتے ہیں جو جاگیرداری میں رہتے ہیں۔ ایسی چیز جو انسان کی تاریخ کے دوسرے اور تیسرے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یا، اب بھی ایسے معاشرے ہیں جو تاریخی دور میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ یعنی ان کے پاس نہ کوئی لباس ہے اور نہ ہی ہاتھ کی لکھائی۔ لہذا، تحریک پیدا کرنے کے لیے تضاد کو موضوعیت میں داخل ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ غربت حرکت کا باعث نہیں بنتی، یہ غربت کا احساس ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ اکثر

اوقات غربت کو قبول بھی کر لیا جاتا ہے اور ایک بار ایسا ہو جائے تو کوئی تضاد نہیں رہتا۔ غریبوں میں غربت کا شعور پیدا کرنا ہوگا۔

تضادات اور مثبت حقائق کو موجودہ نسل کے شعور میں داخل کرنے کا ایک طریقہ ان لوگوں سے مدد لینا ہے جو اس راستے کو پہلے ہی کور کر چکے ہیں۔ یعنی مارکس، سارتر، ہائیڈیگر وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بجائے (جن کا بہرحال ہماری حالت سے کوئی تعلق نہیں) ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ فانون، مولود، یاسین، رادھا کرشنن، چاڈ، کانگو وغیرہ کے مفکرین نے کیا کہا ہے۔ یہ لوگ جو ہمارے جیسے ہیں اور ان کا ایک جیسا مشن ہے جو انہوں نے پورا کیا ہے۔ ہمیں ان لوگوں اور ممالک سے سیکھنا چاہیے نہ کہ ان کی تقلید۔ یہ محض ترجمہ اور نقل ہے۔ اور Aime Cesaire کی نقل کرنا سارتر کی نقل کرنے سے مختلف نہیں ہے۔ ہمیں اپنی تدریس، تحقیق اور طریقہ کار میں ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

س: یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہم 13ویں اور 14ویں صدی کے ثقافتی ماحول میں رہ رہے ہیں، کیا ہمیں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ 20ویں صدی کے یورپی نظریات اب سے چھ سو سال بعد ہمارے استعمال کے لیے ہیں؟

آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ جی ہاں تاہم، آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات ہم بیس سالوں میں پانچ صدیوں کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ اب ہمارے پاس ایشیا اور افریقہ میں ایسے معاشرے ہیں جنہوں نے درست منصوبہ بندی کے ذریعے تیس سالوں میں چند صدیوں کا احاطہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر فکری انقلاب اور سماجی تحریک کا مسئلہ تقویم کی پیمائش کے معیار کے تابع نہیں ہے۔ کبھی کوئی معاشرہ ہزار سالوں میں ایک عہد کا احاطہ کرتا ہے، کبھی کبھی بہت کم عرصے میں۔ میرا ماننا ہے کہ اگر ایک آزاد سوچ رکھنے والا ایک قدیم معاشرے میں رہتا ہے تو اسے اس معاشرے کے جاگیرداری، بورژوا، سرمایہ داری، سامراجیت، سوشلزم وغیرہ میں تبدیل ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اپنے معاشرے سے واقف ہو تو ان مراحل سے گزر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آزاد مفکر تاریخی عزم کو استعمال کر سکتا ہے، اسے مختصر کر سکتا ہے، اسے چھوڑ سکتا ہے، یا اسے تبدیل کر سکتا ہے۔

اگر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم 14ویں صدی میں ہیں اور بعد میں 14ویں صدی کے طریقوں کے ساتھ اپنے معاشرے کے ساتھ کام کرتے ہیں تو ہم نصف صدی سے بھی کم وقت میں 20ویں صدی میں پہنچ جائیں گے۔ میرا مطلب 20ویں صدی کی نقل کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ فینن بیان کرتا ہے، "ہم کبھی بھی افریقہ سے ایک اور یورپ یا امریکہ نہیں بنانا چاہتے۔" امریکہ میں کیا کرنا تھا؟ ایک مختلف یورپ، لیکن وہ A کے امریکہ کے ساتھ ختم ہوا! اگر ہم افریقہ کو یورپ میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے تو ہمارے پاس دو امریکہ ہوں گے۔ کیا یہ اس کے قابل ہے؟

ہم نہ یورپ بنانا چاہتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا امریکہ، بلکہ ایک انسانی معاشرہ بنانا چاہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ نے انسانی معاشرہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے بات کی اور بلف کیا، لیکن انہوں نے بالکل اس کے برعکس کیا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ ان تمام انسانوں کو مار ڈالا جنہیں وہ مل سکتے تھے۔ ہم قطعی طور پر انگلینڈ، امریکہ اور فرانس کے ساتھ نہیں جانا چاہتے۔ کبھی نہیں!

س: معاشرے کی تعمیر میں فری تھنکرز کا مشن کیا ہے؟

اگر آزاد سوچ رکھنے والے کے پاس کوئی مشن ہے تو وہ آگے بڑھ رہا ہے، ورنہ اسے تاریخی عزم کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس صورت میں انسان ذمہ داری اور مشن کی بجائے عزم و ارادے کا شکار ہو جائے گا۔ پرووڈینشل ڈیٹرمنزم اور تاریخی ڈیٹرمنزم میں کیا فرق ہے؟ ایک دعویٰ کرتا ہے کہ خدا نے ہمیں جیسا بنایا ہے جیسا کہ ہم ہیں، جب کہ دوسرا انسان کی تقدیر کو تاریخی تعین سے جوڑتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہے کہ انسان کو خدا کا بنایا جائے

س: سوچ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے تاکہ ہم چھلانگ لگا سکیں، کیا ہمیں پہلے ٹیکنالوجی کا مالک ہونا چاہیے؟

جس معاشرے میں شناخت نہ ہو وہ ٹیکنالوجی کا مالک اور مغربی ٹیکنالوجی سے آزاد کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کس معاشرے نے کیا ہے؟ جاپان کے پاس ٹیکنالوجی ہے جب سے اس کی شناخت ہے۔ جس معاشرے میں روحانی کردار نہ ہو وہ

ہمیشہ صارف ہی رہے گا۔ اگر وہ پیدا بھی کر سکتی ہے تو پھر بھی سرمایہ دار کے ہاتھ میں ایک آلہ بنے گی۔

سوال: کیا ہم ان کی دھن پر رقص کرنے کے بجائے ٹیکنالوجی بنا سکتے ہیں اور اپنے طریقے سے چل سکتے ہیں؟

اقتصادی پیداوار تک پہنچنے کے لیے، ہمیں سب سے پہلے ثقافتی پیداوار کو پورا کرنا ہوگا۔ ہم "ثقافتی طور پر" مغرب کی کالونی نہیں رہ سکتے اور صنعتی طور پر آزاد نہیں ہو سکتے۔ یہ ناممکن ہے. جو فرد ایک سادہ چیز کا انتخاب نہیں کر سکتا وہ مغرب کے سامنے اپنی تکنیکی آزادی کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

ایک بندے کو اپنی معاشی آزادی حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنی انسانی آزادی حاصل کرنی چاہیے۔ ذہنی اور اخلاقی طور پر اسے سب سے پہلے اپنی انسانی آزادی تلاش کرنی ہوگی۔ باس کے گھر کو چھوڑ دو، اور کسی دوسرے کام کے پیچھے جاؤ۔

اور اس لیے ہمیں سب سے پہلے ثقافتی پیداوار شروع کرنی چاہیے تاکہ ہماری معاشی پیداوار ہو، ورنہ ہم ہمیشہ کے لیے صارف ہی رہیں گے۔ کیا آپ نے کبھی تہران میں 1970 کے بوئک کے پیچھے کسی آدمی کو دیکھا ہے؟ وہ اس قدر پھولے ہوئے کام کرتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اسے ایجاد کیا ہو! یہاں تک کہ ایک چوہا بھی اپنا پیسہ بچا سکتا ہے اور ایک خرید سکتا ہے! مغرب والے اعلان کرتے ہیں کہ وہ چاند پر پہنچ گئے ہیں اور ہم یہاں پرجوش ہو گئے! اس کا ہم سے کیا تعلق؟

سوال: کیا ثقافتی پیداوار اور اقتصادی پیداوار ساتھ ساتھ نہیں چلنی چاہیے؟

جب تک انسان نے خود شعور حاصل نہیں کیا، وہ معاشی شعور نہیں رکھ سکتا۔ اسے پہلے انسان بننا چاہیے۔ سوچیں، منتخب کریں، تخلیق کریں، یورپی بات چیت کو دوبارہ شروع کریں، اور اس کے بجائے اپنے بارے میں بات کریں۔ مغرب سے آزاد ہونے کے لیے، مجھے اسے جاننا چاہیے اور 'ذہنی آزادی' کے مرحلے تک پہنچنا چاہیے۔

س: لیکن مغرب ہمارے اس تک پہنچنے کا انتظار نہیں کرتا۔ کیا ان کی تکنیکی ترقی کی شرحِ ہماری رفتار کے متناسب ہو گی؟

جی ہاں یہ نظریہ 'سال 2000 کی کانفرنس' میں تیار کیا گیا تھا۔ تاہم، اسے مغربی ماہرینِ سماجیات نے پیش کیا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اب سے تیس سال بعد ایشیائی GNP 5 گنا آگے بڑھے گا، لیکن مغرب کی GNP 30 گنا آگے بڑھے گی۔ یعنی ہمارے درمیان فاصلہ مستقبل میں اس سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گا جتنا کہ اب ہے۔ تاہم، وہ "چھلانگ" کے عنصر کو خاطر میں نہیں لے رہے ہیں۔ وہ کیسے پیمائش کر رہے ہیں؟ ان کی ترقی کی موجودہ شرح کے ساتھ۔ بلاشبہ، اگر ہم موجودہ عوامل کو تیس سال تک مستقل رکھیں تو وہ درست ہیں۔ لیکن یہ عوامل مستقل نہیں رہتے۔ اب ہمارے پاس ایشیا میں ایسے معاشرے ہیں جن کی پیداوار کی شرح پچھلے ہزار سالوں سے مستقل رہی ہے۔ تاہم، اچانک پچھلے دس سالوں میں انہوں نے ایک سے زیادہ چھلانگ لگائی ہے۔ ذہنی اور سماجی چھلانگ کی وجہ سے ان کی GNP نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ مغربی ماہرین سماجیات اس "لیپ فیکٹر" کو خاطر میں نہیں لاتے (جس کے ساتھ مشرق کا کنارہ ہے)۔

س: اگر آپ سال 2000 کی کانفرنس کی پیشین گوئیوں کو قبول نہیں کرتے ہیں تو آپ مستقبل کو کیسے دیکھتے ہیں؟

میں پیش گوئی نہیں کرتا۔ پیشین گوئی مغربی ماہرینِ سماجیات کی ہے۔ میں حال کا مطالعہ کرتا ہوں۔ تاہم، میں جانتا ہوں کہ سال 2000 میں صارفیت ختم ہو جائے گی۔ اور میں جانتا ہوں کہ تاریخ میں ہمیشہ "نظریہ" کی فتح رہی ہے۔ اب ہم ایشیا اور افریقہ میں نظریہ رکھتے ہیں۔ میں اسپینگلر کے دور سے ہی مغربی زوال کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ایشیائی گراف اوپر جا رہا ہے، اور مغربی گراف نیچے آ رہا ہے۔ فتح مشرق کی ہے۔

سوال: کیا ہم کبھی بین الاقوامیت تک پہنچ سکتے ہیں؟

بین الاقوامیت بہت بڑا جھوٹ ہے۔ یہ عالمی طور پر ہمیں استحصال اور دھوکہ دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فرض کریں کہ یہ کسی دن حقیقت بن سکتا ہے، پھر "جناب" کی جگہ "مسٹر پرولتاریہ" لے جائے گا۔

میں بین الاقوامیت کو صرف اسی صورت میں قبول کرتا ہوں جب ایشیا اور افریقہ میں 500 ملین مغربی باشندوں کے برابر ایک "آزاد انتخاب" والی شخصیت ہو۔ اس صورت میں میں اسے ہیومنزم یعنی انسانیت کی مساوات کے طور پر قبول کروں گا۔ تاہم، جب تک میں انسان نہیں ہوں، اور مجھ پر آدم خور ہونے کا الزام ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مغرب والوں کی میرے ساتھ شراکت داری ایک غلام فورمین کے رشتے جیسی ہوگی، یا سرمایہ دار کے ساتھ خالی ہاتھ آدمی۔ پہلے والے کو محنت کرنی چاہیے، تاکہ بعد والے کو سارا منافع مل سکے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جعلی شراکت داری پیدا کرنے کی ایک بڑی وجہ بین الاقوامیت ہے۔ کیا خالی ہاتھ آدمی کی کسی امیر کے ساتھ شراکت داری جھوٹ نہیں ہے؟ کیا کوئی امیر اپنی مرضی اور پیسے کی بنیاد پر یہ کام پورا کر سکتا ہے؟ یہ ایک حاجی بازاری کی طرح ہے، جب وہ سب کا استحصال کر رہا ہے، وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سب کا دینی بھائی ہے اور وہ حسین کا ماتم کرنے مسجد جاتا ہے! ویسے بھی یہاں مذہبی بھائی چارے کا کیا مطلب ہے!؟

جب پرولتاریہ بورژوا ہوتا ہے تو وہ بورژوازی ہوتا ہے۔ مجھے اس کے پس منظر کی کوئی پرواہ نہیں! ہاں، ایڈورڈ ہیتھ ایک بڑھئی کا بیٹا بھی تھا۔ کیا اب ہم اسے بڑھئی کے لڑکے کے طور پر دیکھتے ہیں؟ اس طرح، جب ایک پرولتاریہ بورژوا بن جاتا ہے، تو معاشرہ بورژوازی ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اب ہمارے پاس بورژوا طبقہ نہیں ہے، ہمارے پاس ایک بورژوا معاشرہ ہے جو اپنی کھپت کو بڑھانے کے لیے ہر ایک کا استحصال کرتا ہے۔

مجھے سوچنا چاہیے اور خود ہونا چاہیے۔ جب بھی میں انسان بن گیا ہوں، بین الاقوامی برادری کے ساتھ برابری کا درجہ حاصل کیا ہوں، ساتھ ہی فیصلہ سازی کی طاقت بھی حاصل کی ہوں، تب میں یہ دعویٰ کروں گا کہ تمام مرد برابر ہیں۔ لیکن جب تک بین الاقوامیت مجھے ایک انسان کے طور پر تسلیم نہیں کرتی، میرے پاس اس سے کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ بین الاقوامیت کیا ہے؟ یہاں تک کہ مغربی اقوام کے پرولتاریہ بھی مجھے چیر رہے ہیں!

سوال: کیا یہ ان کی تکنیکی ترقی کی وجہ سے ہے کہ مغربی ممالک نے اتنی معاشی خوشحالی حاصل کی ہے؟

کیا آپ کو لگتا ہے کہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرنے کی وجہ سے یورپیوں کی معیشت خوشحال ہے؟ فرانس میں ایک ٹیکسی ڈرائیور 6 گھنٹے کام کرتا ہے اور باقی 18 گھنٹے لیٹ جاتا ہے اور اس دوران وہ مالی پریشانی سے محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ اس کے کام یا اس کے ملک کی افریقہ کی لوٹ مار کی وجہ سے ہے؟ فرانس الجزائر سے ون روز کی بوتل 10 سینٹ میں خریدتا ہے، افریقہ سے ٹماٹر تقریباً کچھ بھی نہیں، اور چاڈ کے کافی فارمز مفت میں کرایہ پر لیتا ہے! وہ کافی کی کٹائی کے لیے چند ننگے اور غریب افریقیوں کو روزانہ 9.00$ ادا کرتی ہے اور اس دوران وہ فخر کرتی ہے کہ سرمایہ داری اچھی ہے کیونکہ وہ کارکنوں کو بہت زیادہ تنخواہ دیتی ہے۔ اس دوران وہ مڑ کر وہی کافی لاکھوں ڈالر میں بیچتی ہے۔ فرانس اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرتا، وہ ان سب کو چرا لیتی ہے!

س: تو، آپ کوئی نظریہ پیش کر رہے ہیں؟

نہیں میں کوئی تھیوری بنانے والا نہیں ہوں۔ جو کوئی نظریہ بناتا ہے وہ صرف یونیورسٹیوں کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ ویسے بھی نظریہ کیا ہے؟

س: یورپ کے لوگ ترقی پسند سوچ کے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں، وہ اس طرح کا برتاؤ کیوں کر رہے ہیں؟

میرے خیال میں وہ متعصب ہیں۔ وہ اپنی برتری پر یقین رکھتے ہیں، اور انہوں نے ایک قسم کی سوچ کا ماحول بنایا ہے، جسے "ایگو سینٹرزم" کہا جاتا ہے، جو کہ خود پرستی ہے۔ ایک انا پرستی والا فرد دوسروں کو انسان کے طور پر شمار نہیں کرتا ہے۔ یہ فلسفہ قدیم یونان سے ہی مغرب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ انسان پرست، ماہر بشریات اور سوشلسٹ بھی انا پرستی کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ ان سے انسانی تعلقات ان کے اپنے طبقات کے تعلقات تک محدود ہیں۔ وہ آفاقی تعلقات پر بحث نہیں کرتے۔

میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ 19ویں صدی میں عظیم سوشلسٹ، ہیومنسٹ، اور جمہوریت اور مساوات کے علمبرداروں نے ہر چیز کے بارے میں بات کی (یہاں تک کہ انہوں نے مزدور اور آجر کے درمیان لمحہ بہ لمحہ تعلقات کا بھی باریک بینی سے تجزیہ کیا)، لیکن استحصال کا کبھی ذکر نہیں کیا!

مجھے یہاں ایک چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ انسانی اور سماجی مسائل میں ہمیں سخت سائنسی طریقہ کار کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر، جب کسی سائنسی مسئلے سے نمٹتے ہیں، تو ہم اس کے درست یا غلط ہونے پر توجہ دیتے ہیں۔ تاہم، سماجی مسائل میں ہمیں بیان کی منطق پر توجہ نہیں دینی چاہیے، بلکہ ہمیں مسئلے کے جغرافیہ پر توجہ دینی چاہیے۔

مشرق میں ہم انہی مذاکرات کا شکار ہیں جنہوں نے مغرب کو زندگی بخشی۔ مثال کے طور پر، بعض اوقات ایک "ازم" جس نے مغرب کو غلامی سے بچایا اور اسے متحد کیا، ایک خاص تاریخی دور میں مشرق کی طرف اپنا راستہ تلاش کیا اور تفاوت اور تفرقہ کا باعث بنی۔ یا پھر وہی قوم پرستی جو 16ویں اور 17ویں صدی میں ترقی کا سبب بنی اور جس نے آسٹریلیا، فرانس، انگلینڈ اور جرمنی کی تعمیر کی، وہ تفاوت اور 19ویں صدی میں اسلامی طاقت کے ٹوٹنے کا سبب بنی۔

اس طرح ظاہر ہے کہ کسی سماجی مسئلے کی سچائی اور جھوٹ اور منطقی اور غیر منطقی بات کے علاوہ کسی مسئلے کے جغرافیہ کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ فرض کریں کہ کوئی یتیم ہے جسے وراثت میں کچھ جائیداد ملی ہے۔ اس دوران میری نظر اس کی دولت پر ہے اور میں اسے چیرنے کا طریقہ سوچ رہا ہوں۔ میں کیا کروں تاکہ وہ میری سوچ کو نہ پڑھ سکے؟ مجھے اس میں بہت سی حساسیتیں پیدا کرنی ہوں گی۔ مثال کے طور پر، مجھے اس سے کہنا ضروری ہے، "انسان بننے کا بہترین طریقہ علم کا سہارا لینا ہے۔" مجھے علم کی افادیت کو اس کے سر میں ڈالنا چاہیے اور اسے لندن بھیجنا چاہیے۔ مجھے اسے سائنسی اور فلسفیانہ کتابیں پڑھنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ یا، اگر بچہ مذہبی جذبات رکھتا ہے، تو میں اسے نماز کے بعد جانے کا حکم دوں، وغیرہ۔ بچہ اگر صحیح کام کرنے جا رہا تھا تو وہ میرا گریبان پکڑے گا اور کہے گا، "ارے پیسے پاس کرو!"

اس طرح ہر چیز کو اس کے جغرافیہ کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنا اور رکھنا چاہیے۔ ہمیں محض "گفتگو اور الفاظ" پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ پہلے "گفتگو کرنے والے" کا جائزہ لینا چاہیے۔

س: آگاہی کے لیے آپ کون سے ذرائع تجویز کرتے ہیں؟

ہمیں کسی خاص ذریعہ کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے جو ہمیں آگاہی فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو بہت سی پرانی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ یہ توہم پرستی اور خرافات کے مجموعے کے طور پر میرے ذہن میں رہے یہاں تک کہ میں یورپ جا کر برگ کا طالب علم بن گیا۔ میں نے وہاں جو طریقہ کار سیکھا اس سے میں نے ان تمام توہمات اور خرافات کو بیداری پیدا کرنے والے عناصر میں تبدیل کر دیا۔ مثال کے طور پر، ساتویں صدی کے بارے میں ایک غلط کہانی مجھے آگاہی فراہم کرے گی کیونکہ میں سیاق و سباق، افراد اور اس مقصد کو تلاش کروں گا جس کے لیے یہ کہانی لکھی گئی تھی۔

بات یہ ہے کہ جب کسی کے ہاتھ میں طریقہ کار ہو تو جھوٹ اسے ماضی کے مخصوص دور کو پہچاننے میں مدد دے گا۔ اس کو پورا کرنے کے لیے ایک مخصوص نقطہ نظر ہونا چاہیے، اور تاریخ میں کچھ خاص چیزوں کو تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد، ہم اپنی موجودہ ثقافتی بنیادوں اور بیداری کی تعمیر کے لیے ضروری اجزاء تلاش کرنے کے لیے معلومات کے ایک ٹکڑے کا استعمال کر سکتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آج کے ساتھ ساتھ اپنے آنے والے کل کے حالات سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر وجودیت کو دیکھیں۔ وجودیت کی فلسفیانہ بنیاد یہ ہے: انسان پہلے وجود رکھتا ہے، اور وہ اپنا جوہر (خصوصیات اور خصوصیات) بعد میں بناتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے اپنے ملا صدرا نے ماضی میں بھی ایسی ہی بات کی ہے۔ لہٰذا، اگر ہم اپنے ماضی کے ساتھ تاریخی اور فلسفیانہ تعلق برقرار رکھتے ہیں، تو ہمارے پاس تازہ ذہنیت اور نظریات پروان چڑھیں گے، بجائے اس کے کہ مغرب والوں کی باتوں کو فارسی زبان میں ڈب کیا جائے۔ وجودیت پسندی ہمارا ملک ایک نادان مغربی تقلید ہے جسے فلسفہ کہلانے کے لیے ہمارے 3000 سال پرانے تھیوسوفیکل تجربے سے مالا مال ہونے کی ضرورت ہے۔

جب میں یورپ میں تھا، رادھا کرشنن بیلجیئم آئے تھے۔ چونکہ میں اسے پسند کرتا ہوں میں اس سے ملنے گیا۔ بیلجیئم میں انہوں نے مذاہب کی تاریخ پر ایک لیکچر دیا۔ میں نے پورے یورپ کے عظیم سائنسدانوں کو دیکھا جو اس کی موجودگی میں بچوں کی طرح محسوس کرتے تھے۔ یعنی جب بھی مسٹر رادھا کرشنن نے

کسی نقطہ نظر کا اظہار کیا تو وہ اپنے موضوع سے اس قدر بخوبی واقف تھے کہ یورپی سائنس داں اپنے نبی کے ارد گرد رسولوں کی طرح محسوس کرتے تھے۔ اور جب وہ کوئی سوال پوچھنا چاہتے تھے تو وہ محتاط اور ڈرپوک تھے۔ جب کرشنن جیسا آدمی (مشرقی تھیوسوفیکل مکاتب سے واقف ہے) بات کرتا تھا، تو وہ اس تمام خوبصورتی اور گہرائی سے مسحور ہو جاتا تھا۔ ان لمحوں میں یورپیوں کو احساس ہوا کہ یورپ میں ایک نئی شخصیت موجود ہے! بدقسمتی سے ہم یورپی ریگرگیٹیشنز پر گھومتے ہیں اور ہیش کرتے ہیں، جبکہ کرشنن جیسے آدمی نے انسانیت کے کھانے کی میز کو ایک نئی اور تازہ ڈش پیش کی ہے۔

1961 میں، جب نہرو فرانس آئے، ہندوستانی سفارتخانے نے (تمام دوسرے لوگوں کے برعکس جو فرانسیسی رقص اور شراب کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) ہندوستانی پکوان پیش کیے۔ جب یورپی معززین ملنے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ چیزیں مختلف تھیں۔ اس نے فرانسیسیوں کو احساس کمتری کا شکار کیا، کیونکہ دو صدیوں کے استحصال کے بعد ہندوستانی اپنی روایت پر مضبوطی سے کھڑے تھے۔ اس سے یورپیوں کا احترام بڑھ گیا۔

میرا مطلب اصلیت اور آزادانہ سوچ سے ہے، بجائے اس کے کہ ہمارے ایرانی فری تھنکرز کے مارکس کے نظریات کی سو سالہ ریگرگیٹیشن جو کسی کے کام نہ آئے۔ وہ لوگ جو افریقہ اور ایشیا میں کامیاب ہوئے ہیں وہ ایسے ہیں جو یورپی فلسفے سکھانے اور انہیں بھلانے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ اپنے موجودہ ثقافتی، تاریخی اور سماجی وسائل کی بنیاد پر اپنے معاشروں کو جاننے، نئے حل تلاش کرنے اور تجویز کرنے اور ایک نئی بنیاد بنانے کے قابل تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی کامیاب ہو گئے ہیں!